حضرت مولانا برہان الدین سنبھلی

علماءِ دین اور دنیوی علوم و فنون میں مہارت

یہ مقالہ دارالعلوم حیدرآباد (ہند) کی طرف سے منعقد کردہ ایک عالمی علمی و دعوتی کانفرنس میں ۱۸ مارچ ۱۹۸۷ء کو پڑھا گیا جس کی صدارت مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کر رہے تھے اور اس میں ہند و بیرونِ ہند کے ممتاز اہلِ علم و دانش۔ مثلاً امام حرم عبداللہ ابن سبیّل، حضرت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی اور مسلم یونیورسٹی کے سابق چانسلر سید حامد صاحبان تشریف فرما رہے تھے۔

علم کی ضرورت و اہمیت آج سب مذاہب و ادیان، اکثر قوموں اور ملکوں بلکہ تمام باشعور انسانی طبقوں اور تھوڑی بہت انسانیت رکھنے والوں کو بھی تسلیم ہے۔ لیکن غالباً ان تمام انسانی مجموعوں میں صرف امت مسلمہ کہلانے والی جماعت اور عرفِ عام میں "مسلمان" کے نام سے پہچانے جانے والے لوگوں کے نزدیک ہی علم و تعلیم کی اہمیت عقلی و سماجی ہونے کے ساتھ ساتھ مذہبی اور دینی بھی ہے کیونکہ یہ امت جس نبی امی فداہ ابی و امی (علیہ افضل الصلوات والتحیات) کی تعلیمات کو سرچشمہ بنائے ہوئے ہے اس پر ہدایت کی پہلی کرن ہی "اقراء" اور "علم بالقلم" کے ضوفشاں پیغام کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس لئے یہ ذرا بھی تعجب کی بات نہیں کہ تعلیماتِ نبوی میں طلبِ علم "فریضہ" قرار دیا گیا۔ "طلب العلم فریضة علی کل مسلم" (مشکوٰۃ ۱/۳۴ بحوالہ ابن ماجہ و بیہقی) اور اسی سے روشنی پا کر فقہ و فتاویٰ کی کتابیں (ان تعلم العلم یکون فرضاً علم حاصل کرنا فرض ہے) کے حکمِ شرعی سے گونجتی نظر آتی ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ "علم کونسا یا کتنا حصہ ہر شخص کے لئے ضروری ہے اور کونسا یا کتنا مجموعی طور پر لازمی ہے۔" یہی وجہ ہے کہ آفتابِ نبوت کے طلوع ہونے اور دعوتی سرگرمیاں شروع ہونے کے ساتھ ہی علم و تعلیم کی محفلوں کے سجائے جانے کا پتہ بھی چلتا ہے۔ اور پھر اس میں شرکت کرنے والوں میں نہ تو رنگ و نسل کا امتیاز تھا نہ ملک و قوم کا فرق، بلکہ خود بھی نورِ ہدایت کی روشنی سے خود کو منور کرنا چاہتا۔ وہ خوانِ علم کی زلّہ ربائی کا بھی

حقدار بلکہ لازماً اس میں حصہ دار بنتا اس طرح چراغ سے چراغ جلے تو گویا علم کا چراغاں ہوا - روشنی کا دائرہ پھیلتا اور بڑھتا رہا - اور انشاء اللہ بڑھتا ہی رہے گا - تاآں کہ اللہ علیم وقدیر کے ارشاد " لیظهره علی الدین کلہ " کا مظاہرہ ہو اور صادق ومصدوق کی یہ پیشین گوئی " لا یترک اللہ بیت مدر ولا وبر الا ادخلہ ہذا الدین " (تفسیر ابن کثیر ۲/ ۲۴۹ بحوالہ مسند احمد) پوری ہو (یعنی یہ روشنی سارے عالم میں چھا جائے گی) پیشین گوئی پوری ہو:

مسلمانوں کے لئے علم کا محرک مذہبی ہے جو سب سے قوی ہوتا ہے اہل نظر جانتے ہی ہیں کہ کم سے کم مشرقی ممالک میں اور قوموں میں کسی کام پر آمادگی پیدا کرنے کے لئے مذہب سے زیادہ قوی محرک اور کوئی نہیں ہے، اس بناء پر یہ حقیقت محل حیرت نہیں کہ مسلمانوں نے اسی مذہبی جذبہ سے، علم، کی طرف ایسی توجہ مبذول کی کہ سب سے آخری امت ہونے کے باوجود پہلوں سے آگے نکل گئے اور اس دوڑ میں آگے نکل جانے کا اعتراف صرف اپنوں نے ہی نہیں بعض انصاف پسند غیروں نے بھی کیا ہے۔

مسلمانوں کی علمی پیش قدمیاں اس کا کچھ ہلکا سا اندازہ اس جائزہ سے ہوتا ہے جو ہمارے محترم مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس صاحب ندوی (معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنو) نے اپنے حالیہ مضمون میں ایک مشہور عرب عالم شیخ انور الجندی کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ کہ مسلمانوں کے علمی خزانہ کے صرف مخطوطات جو حوادث روزگار سے بچ گئے ہیں ان کی تعداد تیس لاکھ ہے۔ اور اس کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لئے تنہا یہ بات کافی ہونی چاہئے کہ مسلم ممالک ہی میں نہیں غیر مسلم ملکوں میں ان کی طرف اس درجہ اعتناء وتوجہ ہے کہ " لیڈن " میں اسلامیات پر جو قلمی کتابیں ہیں صرف ان کی فہرست ہی دس ضخیم جلدوں میں سمائی ہے۔

(اگر فرض کیا جائے کہ ہر جلد میں ۵۰۰ صفحے اور ہر صفحہ پہ ۲۰ کتابوں کا اندراج ہے تو کتابوں کی مجموعی تعداد ایک لاکھ ہوتی ہے۔ یہ تو مغرب کے صرف ایک شہر کا حال ہے (اور وہ بھی مخطوطات کی تعداد کے لحاظ سے) اس کے علاوہ برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہا میں جو تعداد ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے اسکوریل کی لائبریری میں اسلامیات پر چھ سو جلدیں ہیں۔ یہ تعداد تو غیر مسلم ملکوں کی ہے۔ مسلمان ملکوں میں علمی ذخیرہ جتنا کچھ (دوسروں کی دست برد سے) محفوظ رہ گیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ تنہا ایک مسلم ملک ترکی کے صرف ایک کتب خانہ مکتبہ حکمت عارف میں اسی ہزار قلمی کتابیں ہیں۔ اور یہ حال تو صرف ان مضامین کی کتابوں کا ہے جنہیں اسلامیات کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ موضوعات جو آج کل زبان میں سیکولر کہے جا سکتے ہیں ان پر مسلمانوں کی علمی وتحقیقی خدمات بھی کم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے محولہ بالا مضمون میں اس کا بھی سرسری جائزہ لیا ہے (تفصیل کے لئے رسالہ " ذکر وفکر " دہلی شمارہ دسمبر ۱۹۸۶ء کا عنوان " مذاکرات " دیکھئے)

علوم میں اسلامی اور غیر اسلامی کی تقسیم نادرست، ہر ضروری علم فرض کفایہ ہے یہاں اس طرف توجہ دلانا

بھی شاید بے محل نہ ہوگا۔ کہ فقہائے اسلام نے جن علوم کو فرض کفایہ کا درجہ دیا ہے ان میں وہ سارے فنون شامل کئے ہیں جن کا حصول کسی بھی صحیح غرض سے ناگزیر ہو۔ چنانچہ تیرھویں صدی کے معروف شامی فقیہ علامہ محمد امین الشہیر بابن عابدین (م ۱۲۵۲ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق اور مرجع الفقہاء کتاب ردالمحتار کے اندر اس فہرست میں طب، حساب، کتابت، اصولِ صناعات، سیاست، فلاحت اور بہت سے علوم شامل کئے ہیں۔ اور ان کے انداز بیان سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ وہ ہر علم و فن جس کی ضرورت و احتیاج کسی نہ کسی درجہ میں انسانوں اور انسانی معاشرہ کو ہو۔ وہ سب اسی زمرہ فرض کفایہ میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اور اس بنا پر امت مسلمہ میں سے اتنے افراد کا ان میں مہارت و حذاقت حاصل کرنا کہ جس سے انسانی معاشرہ کی ضرورت پوری ہو جائے فرض ہوگا۔ یہاں موصوف کے کلام سے جستہ جستہ حصے پیش کرنا غالباً سامعین پر بار خاطر نہ ہوگا۔

علامہ شامی نے صاحب درمختار علاؤ الدین الحصکفی (۱۰۸۸ھ) کی عبارت (جس کا اجمالی ذکر شروع میں آ چکا ہے۔

واعلم ان تعلم العلم یکون فرض عین و ھو بقدر ما یحتاج لدینہ و فرض کفایۃ و ھو ما زاد علیہ لنفع غیرہ

ہر شخص کے لئے علم کی اتنی مقدار جو دینی لحاظ سے ضروری ہے حاصل کرنا فرض ہے اور اس سے زیادہ مقدار کا جو دوسروں کے لئے نفع رساں ہو فرض کفایہ ہے۔

کی شرح کرتے ہوئے آٹھویں صدی کے ایک ممتاز فقیہ فخر الدین زیلعی (م ۷۴۳ھ) شارح کنز کا یہ قول نقل کیا ہے

واما فرض الکفایۃ من العلم فھو کل علم لا یستغنی عنہ فی قوام امور الدنیا کالطب والحساب واللغۃ وقسمۃ الوصایا والمواریث و الکتابۃ وکذا علم الآثار والاخبار والعلم بالرجال واصول الصناعات والفلاحۃ کالحیاکۃ والسیاسۃ والحجامۃ (ردالمحتار ۱/۲۱ــ۲۰ شرح الدر المختار)

فرض کفایہ ہر اس علم کا حاصل کرنا ہے جو دنیاوی ضرورتوں کے لحاظ سے ناگزیر ہو مثلاً طب، حساب، لغت، وصیت و میراث تقسیم کرنے کے اصول، کتابت، اسی طرح علم الآثار، تاریخ، لوگوں (کے مراتب) کا علم اور دست کاریوں اور کھیتی باڑی کا جاننا۔ مثلاً کپڑا سازی، نیز سیاست اور سرجری

کھیتی باڑی سے لے کر انجنیری تک | اس فہرست میں آپ حضرات نے غور فرمایا ہوگا۔ کہ سیاست، سرجری (حجامۃ دراصل سرجری ہی کی ایک قسم ہے۔) تاریخ (العلم بالرجال) صناعات جن میں معمولی دست کاریوں سے لے کر اعلیٰ درجہ کے ہر قسم کے کارخانوں کا قیام شامل ہے۔ طب (یعنی ڈاکٹری) حساب جس کے اندر میتھمیٹکس اور

جیومیٹری جسے عرب علم الہندسہ کہتے تھے اور جو انجینیرنگ کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس لئے آج کل عربی میں انجنیر کو "مہندس" کہتے ہیں وغیرہ شامل ہیں۔ لکھنا پڑھنا فلاحت (اگریکلچر) وغیرہ وہ سارے فنون شامل ہیں جو مغربی ملکوں میں بھی صدی ڈیڑھ صدی سے ہی مستقل فن سمجھے جانے اور کالجوں و یونیورسٹیوں میں مستقل علیحدہ مضامین کے طور پر پڑھائے جانے لگے ہیں۔ حالاں کہ مسلمانوں نے زائد از ایک ہزار برس قبل ہی اپنے تمدنی و ثقافتی علوم میں ہی نہیں۔ مذہبی علوم میں ان کا شمار کیا اور مستقل موضوعات کی حیثیت سے ان کا حصول یعنی تعلیم و تعلم ضروری قرار دیا۔ اس بنا پر یہ کہنا غالباً بے جا نہ ہوگا کہ یہ سارے علوم بھی اسلامی ہیں ان میں اسلامی اور غیر اسلامی کی تقسیم۔ اغیار نے اسلام کو بھی اپنے مذاہب کے تنگ دائرہ پر قیاس کر کے مشہور کر دی اور پھر شعوری یا غیر شعوری طور پر آج کے مسلمان بھی اسی تقسیم کو حقیقی سمجھنے لگے۔ حالاں کہ اسلام نے ان تمام علوم و فنون کو مذہبی جذبہ ہی سے حاصل کیا۔ اور فروغ دیا تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان شعبوں میں بھی فرقِ مراتب ملحوظ رکھتے ہوئے تقریباً ایسی ہی سرگرمیاں دکھائیں جیسی کہ معروف اسلامی علوم کے تعلیم و تعلم کے بارے میں۔

مسلمانوں کی علمی تحقیقات میں محنتیں چنانچہ جس طرح محدثین نے احادیث کی تفصیل و تحقیق کے لئے طویل طویل سفر کئے (تعداد کے فرق کو نظر انداز کر کے) اسی طرح جیسا کہ نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم نے اپنی معروف زمانہ کتاب "علمائے سلف" میں متعدد مسلم حکماء کے واقعات میں لکھا ہے کہ بہت سے مسلم حکماء و اطباء نے جڑی بوٹیوں کا پتہ لگانے اور ان کی خاصیتیں دریافت کرنے کے لئے بڑے دشوار گذار مراحل طے کئے۔ مثلاً ضیاء الدین ابن بیطار نے نباتات کی تحقیق کے لئے مختلف ملکوں روم، یونان، اسپین کو چھان ڈالا۔ (علمائے سلف صفحہ ۲۲)

مسلمانوں کے دوسرے مفید علموں سے دلچسپی کا اندازہ ان کتابوں سے کیا جا سکتا ہے جو زمانہ گذشتہ کے مسلمانوں نے علوم و فنون کے کثیر شعبوں میں مستقل تصانیف ہزاروں کی تعداد میں چھوڑی ہیں ان کتابوں کی صحیح تعداد کا علم اللہ علیم و خبیر کے علاوہ اور کسی کو نہیں۔

مسلمانوں کی علمی کوششوں کا ایک اندازہ اس کا ایک ہلکا سا اندازہ تعارفِ کتب کی مشہور کتاب کشف الظنون (ملا کاتب چلپی، ۱۰۱۷-۱۰۶۷ھ) پر ایک نظر ڈالنے سے ہو جاتا ہے۔ کہ اس کے اندر مختلف علوم و فنون پر کتابوں کا ذکر (تکملہ کو شامل کر کے) ہزاروں صفحات میں سمایا ہے۔ اور جن علوم و فنون پر یہ علمی ذخیرہ ہے ان کی تعداد بھی ایک صد سے کم نہیں ہے ان میں علم الرصد، علم الحساب اور اس کی مختلف شاخیں جبر و مقابلہ اور جیومیٹری وغیرہ۔ علم المزیج (تنہا اس علم پر ۴۲ کتابیں کشف الظنون میں مذکور ہیں) علم السیاحۃ، علم الطب (اور اس کی مختلف شاخیں) اسی کتاب میں اس علم کے تحت حروف تہجی کے اعتبار سے ۱۷ کتابیں مع تعارف کے

مذکور ہیں۔ تنہا امراضِ چشم پر تقریباً ایک درجن چھوٹی بڑی کتابوں کا ذکر ہے۔ علم الکیمیا (جس سے کیمسٹری بنا ہے)، علم الہیئۃ (جس سے خلائی تحقیق کا دروازہ کھلا ہے اور آج بھی گذشتہ زمانہ کی بعض تحقیقات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہیں) ان کے علاوہ علم التاریخ و جغرافیہ تو وہ فن ہیں جس کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ ان کی ترقی اور عروج کا سبب تنہا مسلم محققین ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

جغرافیہ میں گذشتہ مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں، بڑے شہروں اور سمندروں کی پیمائش و محل وقوع کی تعیین وہ لوگ سینکڑوں سال قبل نئے آلاتِ پیمائش وغیرہ کی ایجادات سے بہت پہلے جو کچھ بتا یا لکھ گئے ہیں اس کی تصدیق جدید ترین تحقیقات سے بھی ہوگئی ہے۔ اس کا اعتراف تنہا مسلمانوں ہی نے نہیں غیر مسلموں (مستشرقین) نے بھی کیا ہے۔ مثلاً موسیو لیبان نے تفصیل کے لئے مولانا سید سلیمان ندوی کی قیمتی کتاب "عربوں کی جہازرانی" دیکھئے۔

کشف الظنون میں تاریخ کے موضوع پر صرف وہ کتابیں جن کا نام (تاریخ یا تواریخ) سے شروع ہوتا ہے ان کی تعداد ۲۰۰ ہے اسی فن کی بقیہ کتب جو دوسرے ناموں سے ہیں ان کی تعداد ۱۳۰۵ ہے اور اخبار کے نام سے نصف صد سے زائد کتابیں تاریخ کی ہیں۔

اجرِ آخرت کا جذبہ | جب گذشتہ مسلمانوں نے یہ تمام علوم مذہبی جذبہ سے حاصل کئے اور اسی جذبہ سے ان کی خدمت انجام دیں اور تصنیفات کیں۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج یہ جذبہ کیوں سرد ہوگیا؟ واقعہ یہ ہے کہ آج کم سے کم مسلمان انجینئر، ڈاکٹر، تاجر، کسان اور دیگر پیشہ ور افراد اپنے اپنے کام فریضہ مذہبی سمجھ کر انجام دیں تو نہ صرف یہ کہ وہ اجرِ آخرت کے مستحق ہوں۔ بلکہ کارکردگی کے معیار اور مقدار دونوں بہتر ہوں۔ اور بہت سی ان شکایات کا ازالہ ہو جائے جن کی بنا پر تمام دنیا بالخصوص ایشیا اور بالاخص ہندوستان میں شدید بے چینی ہے بلکہ تباہی مچی ہوئی ہے۔ اس موقعہ پر ایک روایتی قصہ یاد آرہا ہے۔ وہ یہ کہ کسی صاحب نے اپنا مکان بنوایا اور اس میں تازہ ہوا اور روشنی کی غرض سے روشندان بھی رکھے۔ مکان تیار ہو جانے کے بعد وہ کسی اللہ کے مقبول بندہ اور عارف و دانا شخص کو اس مکان میں کچھ دیر کے لئے شاید برکت حاصل کرنے کے لئے جذبہ سے لائے۔ اس دانا نے جب روشندان رکھنے کی مصلحت صاحب مکان سے دریافت کی تو انہوں نے بلا تکلف وہی بات بتا دی جو ان کے اور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہوتی ہے۔ یعنی تازہ ہوا اور روشنی کی آمد۔ یہ سن کر اس عارف نے کہا کہ اگر تم یہ بھی نیت کر لیتے کہ اس سے اذان کی آواز آئے تو وہ تمام فائدے بھی حاصل ہوتے جو تمہارے پیشِ نظر ہیں اور ان کے علاوہ ثواب بھی اس وقت تک برابر ملتا رہتا جب تک یہ روشندان رہتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج ہم مسلمان ثواب کے بہت سے مواقع محض بے نیتی اور بے توجہی کی بنا پر ضائع کر دیتے

ہیں۔ مجھے علمائے شریعت معاف فرمائیں کہ اس بارے میں ان سے بھی نیازمندانہ یہ شکایت ہے کہ انہوں نے عام طور پر اور اکثر فرض کفایہ کی مثال نماز جنازہ جیسے کاموں ہی سے دی۔ اور ان کا ایسے انداز میں بار بار ذکر کیا کہ عوام بیچارے فرض کفایہ کا دائرہ صرف ایسے ہی چند کاموں اور چیزوں میں منحصر سمجھنے لگے اور ان کے ذہنوں کی رسائی اس حد تک ہو ہی نہ سکی کہ دستکاری، کاشتکاری اور انجینئری اور ڈاکٹری جیسے پیشے اور فنون بھی فرض کفایہ کی طویل فہرست میں شامل ہیں اور ان میں مشغولیت بھی اجر آخرت کا سبب بنتی ہے۔

دینی مدارس میں غیر متعلق فنون کا شغل

لیکن اس کا مطلب یہ نہ لینا چاہئے کہ ان تمام علوم وفنون کی حیثیت یکساں ہے۔ یا (راقم کے نزدیک) آج کل دینی مدارس کے نام سے جو ادارے چل رہے ہیں ان میں، ان علوم کے علاوہ جو علوم دینیہ کہلاتے ہیں ایسے سب علوم وفنون یا ان میں سے بعض کی تعلیم کا بندوبست کیا جانا بھی پسندیدہ ہے۔ جن کا ذکر ابھی فرض کفایہ کے ذیل میں آیا۔ کیونکہ مدارس عربیہ دینیہ کے نصاب میں غیر متعلق علوم وفنون کو مثلاً دستکاریوں وغیرہ کو شامل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ آم کے باغ میں نیم کا درخت لگانا۔ بلکہ آم کے درخت میں نیم کی قلم لگانا۔ نیم کے درخت کو اس کی افادیت اور صحت کے لئے منفعت بخشی کے باوجود مناسب نہیں کہ آم کے درختوں کے درمیان جگہ دی جائے۔ کہ اس سے نفع کے بجائے نقصان کا خطرہ ہو سکتا ہے ٹھیک اسی طرح مدارس عربیہ دینیہ کے قیام ونظام کی جو اصل غرض ہے وہ یقیناً ایسے غیر متعلق علوم وفنون کی پیوند کاری سے متاثر ہوگی اور خطرہ ہے کہ یہ طرز عمل "طمع الکل فوت الکل" کا نتیجہ برآمد کرنے کا کہیں سبب نہ بن جائے (بلکہ جہاں اس کا تجربہ کیا گیا ہے وہاں عموماً اور اکثر یہی نتیجہ سامنے آچکا ہے۔) اسی سبب سے عصری نظام تعلیم کے اداروں میں بھی یہ سنگرگی نہیں کی جاتی۔ کہ انجینئرنگ کالج کے طلبہ کو میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو۔ یا اگریکلچر یونیورسٹی میں ماہر آرٹیکٹ تیار کرنے کی کوشش کی جاتی ہو۔

صحیح طریق کار

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ابتدائی دینی تعلیم کا ایک بہت مختصر کورس پڑھا کر ان مدارس دینیہ سے طلبہ کو رخصت کر کے دوسرے شعبے اور فنون میں مہارت پیدا کرنے کے لئے مطلوبہ فنون کے مخصوص اداروں میں (تعلیم وتربیت حاصل کرنے) بھیجا جائے۔ اور اگر ہو سکے تو امداد بھی دی جائے۔ تاکہ وہ ان اداروں کے اخراجات برداشت کر سکیں۔ جن میں مطلوبہ علوم وفنون کی تعلیم وتربیت کا معقول اور اعلیٰ نظم ہے۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ ایسے طلبہ کی بطور خاص دینی واخلاقی تربیت کا نظم مدارس دینیہ ان کی اس مختصر مدت قیام کے دوران کیا جائے تاکہ وہ آئندہ اپنی زندگی خواہ کسی شعبہ میں مہارت کر کے گذاریں دینی واخلاقی حیثیت سے ممتاز اور سچے پکے مسلمان بنے رہیں۔ لیکن اس سے بھی بہتر صورت یہ ہے کہ مسلمان خود ایسے مستقل ادارے قائم کریں جن میں ہر قسم کی تعلیم کے ساتھ دینی تربیت کا بھی نظم ہو۔

ہر علم و فن میں مہارت و کمال کی اہمیت | یہاں ایک اور اہم بات کی طرف توجہ مبذول کرانا بھی شاید بے جا نہ ہوگا وہ یہ کہ یوں تو ہر زمانہ میں کمال و اختصاص کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے اور صاحب کمال کا مقام بلند ہو رہا ہے۔ لیکن اس زمانہ میں مختلف عوامل کی وجہ سے جن میں ایک اہم عامل تعلیم کا عموم و شیوع ہے۔ اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔ کہ امتیاز کے بغیر آج قدر دانی کی توقع کرنا سراب سے پیاس بجھانے کی توقع رکھنے کے برابر نا معقول بات ہوگی۔ یعنی آج پہلے سے کہیں زیادہ "کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی" جیسے حکیمانہ مقولہ کی معنویت میں اضافہ ہوگیا ہے اور صاحب کمال کا عزیز و معزز ہونا ایسا مسلم اصول ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے کر آج تک غالباً کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ علمائے سابقین میں بے شمار ایسے گزرے ہیں کہ ان کی قدر دانی حکمرانوں نے سونے یا چاندی میں تول کر کی ہے۔ خود ہندوستان میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو یہ امتیاز حاصل ہو چکا ہے۔ اور ایسے بھی واقعات پیش آئے کہ ان کی تصنیفات کو واقعۃً سونے کے مول خریدا گیا۔ اسی ہندوستان کے عربی لغت کے ایک ماہر علامہ مرتضیٰ زبیدی کو یہ شرف ہندوستان میں نہیں، عرب میں بھی حاصل ہوا اس طرح کے واقعات مولانا مناظر احسن گیلانی کی شہرۂ آفاق کتاب "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت") ان واقعات سے نیز ایسے ہی دوسرے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ صاحب کمال کے اعزاز و احترام میں نہ ملکوں کی سرحدیں آڑے آتی ہیں۔ نہ رنگ و نسل کی دیواریں اور پھر یہ کہ جس طرح گذشتہ زمانہ میں یہ اصول بروئے کار لایا جاتا تھا آج بھی اس میں باوجود نیشن اور نیشنلزم کی وبا عام ہونے کے کوئی خاص فرق نہیں پڑا جس کا ثبوت متعدد ایشیائی اور ہندوستانی اصحاب کمال کو نوبل پرائز دیے جانے سے جا ملتا ہے

اہل کمال کی قدردانی | اسی سلسلہ میں اب تک جن قدردانیوں کا ذکر آیا وہ زیادہ تر مادی حیثیت کی تھیں۔ اس کے علاوہ اہل کمال کی معنوی عزت افزائیوں اور کمالات کے اعترافات بھی اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار ہی مشکل ہے جن کا کچھ اندازہ مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کی مذکورہ کتاب سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں اسی کتاب سے ماضی قریب کا ہی ایک واقعہ بطور مثال پیش کیا جا رہا ہے۔

مصر کے مشہور صاحب قلم اور ممتاز عالم المنار کے ایڈیٹر علامہ رشید رضا صاحب ہندوستان آئے تو یہاں کے مختلف بڑے علمی اداروں میں گئے جن میں دارالعلوم دیوبند بھی شامل ہے۔ اس وقت وہاں مایہ ناز محدث امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری قدس سرہ استاذ حدیث تھے۔ مہمان محترم کے اعزاز میں جو دارالعلوم کے اندر جلسہ ہوا اس میں علامہ کشمیری نے ایسی علمی اور فنی تقریر عربی میں کی۔ حاضرین کا بیان ہے کہ علامہ رشید رضا فرط حیرت و مسرت سے اچھل اچھل پڑتے تھے۔ اور بار بار ان کی زبان پہ یہ جملہ آرہا تھا۔

"ما رایت مثل هذا الاستاذ الجلیل قط"

میں نے اس جیسا عظیم استاذ اس سے پہلے نہیں دیکھا۔ اور واپسی پر یہ کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

"لو لا رایتها لرجعت من الهند حزینا"

اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو بہت صدمہ ہوتا۔ (ج ص ۳۵۸)

رشید رضا مصری کا اعتراف اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ بلکہ جب ہندوستان سے واپسی کے خاصے عرصہ بعد حدیث کا پہلا مشہور جامع انڈکس "مفتاح کنوز السنة" شائع ہوا تو اس کے مقدمہ (ص ق) میں موصوف نے برملا اعتراف ہندوستانی علما کی خدمات کا بیان ان الفاظ میں کیا۔

ولولا عنایة اخواننا علماء الهند بعلوم الحدیث فی هذا العصر لقضی علیها بالزوال

فقد ضعف فی مصر والشام والعراق والحجاز حتی بلغت منتهی الضعف

اگر ہمارے دینی بھائی ہندوستانی علماء، علوم حدیث کی اشاعت وغیرہ کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یہ علم دنیا سے رخصت ہو گیا ہوتا۔ کیونکہ جو اس علم کے اصل مراکز تھے وہاں یہ ضعف کے آخری درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ یہ کتاب ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہی سال علامہ کشمیری کی وفات کا ہے اور رشید رضا ۱۹۱۱ء میں ہندوستان آئے تھے۔

زمانہ نہیں بدلا دور کیوں جائیے علوم اسلامیہ کے اندر مہارت و کمال رکھنے والوں کی قدر افزائی کے واسطے چند سال قبل سے دیا جانے والا فیصل ایوارڈ ہندوستان کے دو عالموں کو اس مختصر مدت کے اندر ہی مل چکا ہے ان میں سے ایک ذات گرامی ہماری اور اجتماع کی خوش قسمتی سے ہمارے درمیان موجود ہے یعنی ہمارے مخدوم اور ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے زیادہ نمائندہ تنظیم مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (متعنا اللہ بطول تعالیٰ) اور دوسرے فاضل جنہیں عام طور پر ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی کے نام سے جانا جاتا ہے حالانکہ وہ ڈاکٹر ہونے سے پہلے عالمی شہرت رکھنے والی علوم دینیہ کی درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں کئی سال تک باقاعدہ تعلیم حاصل کر کے اور استاذ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند سے حدیث پڑھ کر سند فضیلت لے چکے تھے۔

موصوف کو فیصل ایوارڈ حدیث شریف کی خدمت ہی کی بنا پر ملا ہے۔ اس لئے انہیں بھی مولانا مصطفےٰ اعظمی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

بزرگو! اگر میں اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی یا مسلم یونیورسٹی کے اندر وہاں کے انجینئرنگ کالج میں یہ مضمون پیش کر رہا ہوتا تو طلبہ سے خطاب کر کے کہتا کہ انجینئرنگ میں کمال حاصل کرو۔ اسی طرح اگر میڈیکل کالج کے اسٹوڈنٹس

سے مخاطب ہوتا تو انہیں متوجہ کرتا کہ ممتاز ترین ڈاکٹر بنو۔ لیکن چونکہ اس وقت حسنِ اتفاق سے میں ایک علوم دینیہ کی معروف درسگاہ کی طرف سے منعقد اجتماع میں یہ گذارشیں پیش کر رہا ہوں اس لئے دینی شعبہ کے طلبہ سے خاص طور پر عرض کرتا ہوں کہ وہ اپنے مضامین میں امتیاز و اختصاص پیدا کریں کہ زمانہ ان کی قدر دانی کرے اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھانے کے لئے آج بھی اسی طرح تیار ہے جس طرح کل تھا۔ بلکہ آج شاید کچھ زیادہ ہی قدر دانی کے ثبوت فراہم ہو رہے ہیں جس کی ایک دلیل اوپر گذری۔ دو شخصیتوں کی مثالیں ہیں یہ کہنا صحیح نہیں کہ "زمانہ بدل گیا ہے"! البتہ شاید کہنے کی بات یہ ہے کہ ہم بدل گئے ہیں کہ ہم اب نہ پہلی جیسی محنت کے عادی رہے اور نہ ان صفات کے لئے مساعی کی کہ جن کی بنیاد پر دنیا قدر دانی کے لئے ہمیں پکارے۔

(اگر یہ علوم دینیہ کے طالبین کا اصل مقصد رضائے خداوندی ہونا چاہئے)

کمال حاصل کرنے کا قرآنی نسخہ | جب امتیاز و اختصاص کا ذکر چھڑا ہی ہے تو قرآن مجید کے بتلائے ہوئے نسخہ کا ذکر بھی مناسب بلکہ ناگزیر معلوم ہو رہا ہے۔ جس کے ذریعہ یہ صفت پیدا کی جا سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ علیم و حکیم نے تین اجزاء پر مشتمل وہ نسخہ بتایا ہے جسے نسخہ کیمیا کہنا شاید مبالغہ نہ ہو گا وہ اجزاء یہ ہیں۔

تقویٰ۔ صبر اور احسان یعنی خدا کی نافرمانی سے بچنے کے ساتھ ہر اس چیز سے پرہیز کرنا جو مقصد کے لئے مضرت رساں ہو اور جن کاموں سے مقصد برآری کی امید ہو ان پر جی جان کھپا دینا (کسی جگہ ہمت نہ ہارنا) اور پھر ہر کام کرتے وقت اس کا لحاظ رکھنا کہ بہتر سے بہتر طریقہ پر انجام پائے۔

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک برگزیدہ نبی حضرت یوسف علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے ادا کرایا ہے کہ جو خود اس نسخہ کی کیمیا اثری اور اثر انگیزی کا تجربہ کر چکے تھے۔

فرمایا :-

انّہ من یتق و یصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین ٥ (سورۃ یوسف ۱۳)

آیئے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان صفات کا حامل بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین ٥

بقیہ از صدا | لی ہے جو لوگ خدمت دین میں مصروف ہیں وہ بھی محفوظ ہوں گے۔

بہر حال ہم پر اللہ کریم نے بڑا احسان کیا۔ قرآن اور حدیث سے ہمارا تعلق جوڑا۔ ہم نبی کی وراثت حاصل کر رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ سب کو اس کا ادب و احترام اور اس کے حقوق اور تقاضے پورے کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔

اس کے بعد دار العلوم حقانیہ، اساتذہ و طلبہ، عالم اسلوم، دار العلوم کے معاونین۔ سرپرست، اراکین و مخلصین، افغان مجاہدین اور جملہ مسلمانوں کے لئے دعا فرمائی ٭